آخری حملہ

وہ دل اور پھیپھڑے کے درمیان ایک کھلی سی ورید میں کھڑا تھا اور غصے سے کانپ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ پیتھوجینک خان اپنے آپے سے باہر ہوا تھا بلکہ ایک ہفتے کے اندر اس پر تین مواقع اسی قسم کے گزرے تھے۔

جب باس کو، جنرل کو، صاحب خانہ کو یا بادشاہ وقت کو غصہ چڑھا ہو تو ماتحتوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ زندہ تو رہتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی بھی ٹھیک ٹھیک سرانجام دیتے ہیں لیکن اُن کے دل اندر سے بجھ جاتے ہیں اور اُن میں کام کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی جو آگے بڑھ کر غنیم پر حملہ آور ہوتی ہے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔

پیتھوجینک خان کے سامنے چھوٹے بڑے رینک کے کئی آفیسر سر جھکائے کھڑے تھے اور اُنہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنے باس کے الزامات و اتہام کا کیا جواب دیں۔ تین دن پہلے بھی کچھ اس قسم کی پیشی ہوئی تھی لیکن پسلائی سپاہیوں کی ایک رجمنٹ کی یقین دہانی پر باس نے سب کو ڈیڑھ دن کی مہلت اور دے دی۔ لیکن اب پورے تین دن ہو گئے تھے اور راحیلہ اُسی طرح بستر پر لیٹی تھی۔ اس پر وہی پہلے دن کی شدت کا بخار تھا، نہ کم نہ زیادہ..... لیکن وہ بدستور زندہ تھی۔

اٹھارہ برس کی دھان پانی سی لڑکی..... بڑے بڑے کولہے، کشادہ کندھے، نامعلوم سا پیٹ، خوبصورت پاؤں، پیلی رنگت۔ پانچ روز سے ڈفتھیریا کے مرض میں مبتلا تھی اور ابھی تک زندہ تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی اور چوٹی کے جراثیم اُس کے اندر جمع تھے اور تین چوٹی کے ڈاکٹروں نے اُسے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ مریض کی حالت تشویش

ناک ہے، یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لئے لواحقین کو ہمارے علاج کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرانی چاہیے۔

راحیلہ جب بھی سوجے ہوئے گلے میں رکے ہوئے سانس سے زچ ہو کر آنکھیں کھولتی تو اپنی امی کو ساتھ کی کرسی پر پتھر کے بت کی طرح بیٹھے دیکھتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی اور کہہ نہ سکتی۔ امی رونا چاہتیں اور رو نہ سکتیں۔ دونوں ہی مجبور تھیں۔ دونوں کی آس ڈوب چکی تھی۔ اور دونوں سمجھ چکی تھیں کہ کیا ہونے والا ہے!

راحیلہ کے اندر چھوٹے بڑے بیکٹیریا اپنی بساط سے بڑھ کر سمیات چھوڑنے پر لگے ہوئے تھے اور خوف سے کانپ رہے تھے کہ وہائٹ بلڈ سیلز چنگیز خانی فوجوں کی طرح ان پر ٹوٹ کے حملے کر رہے تھے۔ اُن کے ایک ہی ہلے میں بڑے بڑے اعلیٰ نسل کے جی دار جراثیم داد شجاعت دیتے ہوئے لقمہ اجل بن رہے تھے۔ مرنے والوں کے خاندان اور قریبی رشتہ دار نالہ و شیون کرتے ہوئے قریبی شریانوں میں گھس کر فریاد کر رہے تھے لیکن خون کے سفید خلیوں کا پلہ بہت ہی بھاری رہا۔

پیتھوجینک خان نے چنگھاڑ کر پیسلائی کے حاضر گروہ سے پوچھا "تمہارے ہتھیار کدھر ہیں؟"

اُنہوں نے رو کر کہا "سر! کل رات ڈاکٹروں نے ہیوی ڈوز کی بھرمار کر دی۔ ہم دن بھر کے تھکے ہارے، شامت کے مارے ابھی ذرا سی ڈھو لگا کر ستانے ہی لگے تھے کہ اینٹی بائیوٹک دواؤں نے ہمارے اُوپر شبخون مار کر اندر سموک سکرین پیدا کر دی ور سکرین کے پردے میں ہمارے ہتھیار اُٹھا کر اُنہیں آن واحد میں ڈزالو کر دیا۔ ہمارے تقریباً پچاس لاکھ جراثیم اس ایک جھڑپ میں ملیامیٹ ہو گئے۔"

"بکواس کرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔" پیتھوجینک خان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا" مجھے احمق بناتے ہو۔ اُلو کا پٹھا سمجھتے ہو۔ میں نے گیارہ قسم کی اینٹی بائیوٹکس کا مقابلہ کیا ہے۔ ہر مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر اُن سے لڑا ہوں اور خدا کے فضل سے کامیاب ہوا ہوں۔ کیا میں اینٹی بائیوٹکس کے مزے، اُن کی خوشبو، اُن کے رنگ اور اُن کی کارکردگی سے واقف نہیں ہوں! تم جھوٹ بولتے ہو اور مجھے احمق سمجھتے ہو!"

ایک لاکھی جراثیم آفیسر نے جس کے دائیں بائیں دس ہزاری پیادہ جراثیموں کے دوپرے کا بریگیڈ کھڑا تھا بڑے ادب کے ساتھ چھوٹی کھرج میں کہا "سر وہ کوئی نئی قسم کی اینٹی بائیوٹک تھی۔ اس نے معدے میں اُترتے ہی ایلکا سیلزر کی طرح بلبلے سے چھوڑے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے محاذوں پر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔"

پیتھوجینک خان نے آفیسر کے کندھے سے اس کے نشان نوچتے ہوئے کہا "بریگیڈئر تم سمجھتے ہو میں بچہ ہوں۔ رموز جنگ سے ناآشنا ایک بازاری چھوکرا ہوں! تمہارا خیال ہے میرے پاس اس اچانک حملے کی خفیہ تفصیل نہیں..... اس جھڑپ کی انٹیلی جنس رپورٹ نہیں۔ میں پاگل ہوں!"

بریگیڈئر نے شرمندگی سے مسکرا کر کہا "کیوں نہیں سر، کیوں نہیں۔ آپ کو تو ایک ایک چیز کا علم ہوتا ہے۔ واقع گزرنے سے پہلے اس کی ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔"

مارشل پیتھوجینک خان نے سنجیدگی سے کہا "وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اینٹی بائیوٹک نہ اس کا دھواں، نہ کوئی سموک سکرین نہ شب خون۔ تم ایک خوف زدہ اور ڈرپوک قوم کے ڈرپوک سپاہی ہو اور تم میں اس ہزیمت خوردہ قوم کی ساری قباحتیں اور نحوستیں پیدا ہو چکی ہیں جو کئی صدیوں تک دوسروں کی غلام رہ چکی ہوتی ہے — سنو! وہ کچھ بھی نہیں تھا پنسلین 500 کی دو گولیاں تھیں جو معدے میں اُتریں اور تمہاری صفوں میں خوف کا بھونچال آ گیا۔"

مارشل نے اس کے دوسرے کندھے کا پھول بھی نوچا اور چیخ کر کہا "بی آف یو بلڈی — میں تمہاری شکل دیکھنی نہیں چاہتا۔ تم سے ایک نحیف و نزار سی لڑکی نہیں ماری جا سکی..... تم کسی صحت مند، ہٹے کٹے اور مضبوط جسم کو کیسے فنا کرو گے!"

بریگیڈئر اپنے پھول نچنے کے ساتھ ہی خاموش ہو گیا تو اس کے کرنل نے کہا "سر ہم اتنے بزدل بھی نہیں ہیں جس قدر آپ سمجھ رہے ہیں۔ دراصل ہم کو کئی محاذوں پر ایک ساتھ لڑنا پڑ رہا ہے اور ہمارے ذرائع بڑے محدود ہیں۔"

کرنل کی یہ بات سن کر مارشل پیتھوجینک غصے سے پھنکارا اور اس نے چلا کر کہا "کون سے کئی محاذ" ہیں جن پر تم داد شجاعت دے رہے ہو اور تمہارے وہ کون

سے ذرائع ہیں جو محدود ہو گئے ہیں اور ہماری بے خبری کی وجہ سے محدود ہو گئے ہیں؟"

کرنل نے کہا "دیکھنے کو یہ ایک دھان پان سی رومانٹیک لڑکی نظر آتی ہے مگر اس کے اندر خون کے سفید خلئے پیدا ہونے کی فیکٹریاں لگی ہیں۔ ہم جہاں بھی اپنی پیادہ جراثیم فوج کے ساتھ حملہ کرتے ہیں خون کے سفید خلئے لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں ہمارے سپاہیوں کو گھیر لیتے ہیں اور اُنہیں تیزی سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے تجربہ کار، بہادر اور سورما سپاہیوں کو پکڑ کر اس بے دردی سے چباتے ہیں کہ اُن کے تیزی سے چلتے ہوئے جبڑوں کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔"

مارشل پیتھوجینک خان نے اس کی بات کو سنجیدگی سے سنا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ کرنل نے حوصلہ پا کر ذرا سا آگے جھک کر کہا "سر! آپ یقین نہیں کریں گے، جب خون کے سفید خلئے ہمارے سپاہیوں کو مکئی کے دانوں کی طرح چبا رہے تھے تو راحیلہ کا منگیتر اس کے بازو سہلاتے ہوئے اور بار بار اُس کے ہاتھ چومتے ہوئے پوچھ رہا تھا..... یہ تمہارے اندر کٹر کٹر کی آواز کیسی آ رہی ہے؟ لیکن جب راحیلہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس نے اپنا کان راحیلہ کے پیٹ سے لگا کر غور سے سنا تو اندر ہماری فوجوں پر فنا کا عمل جاری تھا۔"

مارشل نے کہا "تمہارے خیال میں اس بربادی اور ایسی تیز ہلاکت کا کون ذمہ دار ہے؟"

"ہم ذمہ دار ہیں سر، ہم ہیں۔ لیکن ہم بھی مجبور ہیں کہ ہمارے پاس سامان حرب کی کمی اور فنڈز کی قلت ہے۔"

کرنل کا یہ جواب سن کر مارشل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تلملا کر بولا "اگر اب بھی تمہارے پاس فنڈز کی کمی ہے تو لعنت ہو ہم پر جو فنڈز فراہم کرتے ہیں اور پھٹکار ہو تم پر جو فنڈز میں خرد برد کرتے ہو۔"

کرنل نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور دُکھ بھرے لہجے میں بولا "آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہے سر کہ فنڈز میں گھپلا کہاں ہوتا ہے اور کون لوگ اس میں ملوث ہیں۔ ہم بد نصیب تو خواہ مخواہ پٹتے ہیں اور مفت میں جھڑکیاں سہتے ہیں.... اگر ہم کو یہ

معلوم ہوتا کہ —"

لیکن مارشل نے کرنل کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور سوچتے ہوئے بولا "اگر تم لوگوں کو کچھ اور فنڈز نئے سرے سے فراہم کر دیئے جائیں اور فوراً کر دیئے جائیں تو پھر تم ایک نیا حملہ کرنے میں اور کتنی دیر لگاؤ گے؟"

"جتنی دیر میں ایک نیا نقشہ تیار ہوتا ہے سر، بس اتنی دیر — نفری تو ہمارے پاس کافی ہے۔ اور جوان بھی بڑے جی دار ہیں... لیکن...."

"ابھی تو تم اپنے جوانوں کی بے پناہ ہلاکت کا ذکر کر رہے تھے" مارشل نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اور اب کہہ رہے ہو کہ ہمارے پاس کافی نفری موجود ہے۔"

"وہ سر بات یہ ہے" کرنل نے سرگوشی میں کہا "راحیلہ کی باڈی میں کچھ دستے ٹائیفائیڈ کے جراثیموں کے گئے اور سالمونیلا ٹائی فی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔"

"یہ کدھر سے آ گئے؟" مارشل پیتھوجینک نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ سب اس کا کرم ہے سر" کرنل نے خوش دلی سے کہا "جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرا خودبخود کھل جاتا ہے۔ میں اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتا سر لیکن شاید اس کی ماں نے اُسے وہی دودھ پلانے کی کوشش کی ہو جو کل کا فریج میں پڑا تھا۔"

"خوب خوب!!" مارشل نے اپنے کرنل کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "اُن کو ساتھ ملاؤ۔ اُن سے کام لو اور اُن کو خوش کرو۔ میں تمہارے لئے خصوصی فنڈز کا ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

کرنل نے ایڑی ملا کر اور پنجے کھول کر ہاتھ کے ایک جھٹکے سے مارشل کو سلیوٹ کیا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مارشل پیتھوجینک گردوں اور کلیجی کا ایک سرسری سا معائنہ کرنے کے بعد تلی کے تفصیلی جائزے کے لئے تلی کی سرحد پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک افراتفری اور نفسانفسی کا عالم تھا۔ راحیلہ کے بدن کے گوشے گوشے سے دھڑا دھڑ جنازے آ رہے تھے اور تلی کا قبرستان نئی قبروں سے لبالب بھر گیا تھا۔ بدن کے خلیوں کی اندھا دھند ہلاکت سے

محدود گورکنوں کی جانیں عذاب میں پڑ گئی تھیں اور اُنہوں نے ایک ایک قبر میں سینکڑوں خلیوں کو ایک ساتھ دفن کرنا شروع کر دیا تھا۔ مارشل نے اپنی ٹوپی کا چھجا اُوپر اُٹھا کر دور دور تک دیکھا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ تلی کے سارے قبرستان بڑی بڑی اجتماعی قبروں سے پٹ گئے ہیں اور اب وہاں مردے دفنانے کی مزید گنجائش باقی نہیں رہی۔ اب ضرورت بدنی کے تحت بڑی آنت اور چھوٹی آنت کے مختلف راستوں میں نئے قبرستانوں کی گنجائش نکالی جاری ہے اور آنتوں کے راستے بھی چھوٹی بڑی قبروں سے معمور ہو گئے ہیں۔

خلیوں کے بڑھتے ہوئے قبرستانوں سے خوش ہو کر مارشل نے راحیلہ کے دونوں گردوں کا معائنہ کیا۔ اس فرنٹ پر اس کے جوان بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے اور ڈیفنس کے ناکے توڑ رہے تھے۔ یہاں اس نے سپلائی کے دونوں ڈپوؤں سے دریافت کیا کہ اُنہیں مزید فنڈز کی کس قدر ضرورت ہے تو پتہ چلا کہ وہ پرانے سٹاک سے ہی کام چلا رہے ہیں اور راحیلہ کے ختم ہونے تک اس سے کام چلاتے رہیں گے۔

مارشل نے کہا "لیکن اب تک تو راحیلہ کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟" تو ایک موٹے پیٹ والے صوبیدار میجر نے کہا "سر جب تک گلے کے اندر کی نفری جان پر کھیل کر نہیں لڑے گی اور فریش ٹاکسن تیار کر کے لیتھلی ہتھیاروں سے دل پر حملہ نہیں کرے گی اس وقت تک ہم کامیاب نہیں ہوں گے۔ ڈفتھیریا میں سر جب تک گلے کے اندر بننے والا زہر ڈائرکٹ دل میں اور دل کی شریانوں میں نہیں اُترتا اس وقت تک دشمن فال نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں سر کہ راحیلہ کے گلے کے اندر کا فرنٹ کافی کمزور ہے اور اس میں ہم مار کھا رہے ہیں۔"

مارشل پیتھوجینک صوبیدار میجر کی بات پر غور کرتا ہوا وہاں سے دل کی جانب روانہ ہوا تو راستے میں اُسے خیال آیا کہ وہ اس وار پلان کے جنرل مائیکروب سے تو ملا ہی نہیں۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی سواری کا رُخ شہ رگ کی طرف پھیر دیا۔ یہاں جنرل مائیکروب کا ہیڈ کوارٹر تھا اور دور دور تک اس کے سٹاف کے تنبو لگے تھے۔

جب مارشل اس ایریا کمانڈ کے اندر داخل ہوا تو ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جوانوں کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں قطاروں میں سج کر چاق و بند دستوں میں منقسم ہو

گئیں۔ ہر طرف سلیوٹ کے کاشن ملنے لگے۔ اور مارشل مارچ پاسٹ کا معائنہ کرتے ہوئے جنرل کی چھولداری میں پہنچ گئے — لیکن جنرل وہاں موجود نہیں تھا اور چھولداری خالی پڑی تھی۔

مارشل نے گرج کر جنرل کی ناموجودگی کی وجہ دریافت کی تو کونے میں چائے کا مگ گرم کرتے ہوئے بیٹ مین نے کانپتے ہوئے کہا "سر! وہ چھوٹی شہ رگ سے ہو کر ابھی اُوپر دماغ میں گئے ہیں، وہاں ہماری نفری فال کر گئی ہے۔"

مارشل پیتھوجینک بڑی شاہ رگ میں سے اُوپر چڑھ کر دماغ کی سرحد پر پہنچے تو وہاں بینائی کی نرو کے پاس جنرل مائیکروب دشمن کے سپاہیوں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے اور کسی گہرے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ مارشل نے ذرا سا ٹھٹک کر اُنہیں غور سے دیکھا اور پھر اُن کے قدم وہیں جم گئے۔

اُن سب کے درمیان کسی پیچیدہ مسئلے پر گرما گرم بحث جاری تھی اور وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کی باریکیوں کی داد دے رہے تھے۔ مسئلہ کچھ غور طلب معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کرنے کے باوصف وہ سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور نگاہیں جما کر ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے۔

مارشل غصے سے بپھرا ہوا آگے بڑھا تو جنرل نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی ٹوپی کے کنارے کو اُنگلیوں سے چھوا اور مسکرا کر مارشل پیتھوجینک کو خوش آمدید کہا۔ خون کے سفید خلیوں کا تعارف جنرل نے مارشل سے کرایا تو مارشل کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ اس نے اپنے جنرل کے نئے ساتھیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا "یہ سب کیا ہو رہا ہے جنرل اور یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم محاذِ جنگ پر دشمنوں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہو؟ یہ کس عزم کی پاس داری اور کس رویے کی ترجمانی ہے جو تم اُن کے اس قدر قریب آ گئے ہو؟"

جنرل نے مسکرا کر کہا "سر! جب سے ہم نے راحیلہ پر حملہ کیا ہے اور جس روز سے اس کے اندر ہمارا محاذِ جنگ کھلا ہے، میں راحیلہ کے کمرے کی چیزوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں اور اُنہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آج تیسرا دن ہے سر اور میں ابھی تک رنگین ٹیلی ویژن کی ورکنگ کو نہیں سمجھ سکا۔ بھلا کسی دوسرے مقام کی

تصویر بغیر کسی کنکشن کے کس طرح اس ٹی وی سیٹ میں پہنچ سکتی ہے.... پھر وہ بھی رنگین اور اپنے سارے رنگوں کی جزئیات کے ساتھ؟"

مارشل نے گھور کر جنرل مائیکروب کو دیکھا تو اُس نے کہا "سر اس کے ساتھ ہی ایک فیکس مشین رکھی ہے جو سات سمندر پار کے کاغذ کا چربہ یہاں، اس کمرے میں اُتار کے رکھ دیتی ہے.... ہو بہو نقشہ، پوری تفصیلات، نقل مطابق اصل۔ میں تو حیران ہوں سر کہ ایسا کس طرح سے ہوتا ہے! میں اس کا راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور تین دن سے سر مار رہا ہوں لیکن مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آتا.... کچھ بھی پکڑائی نہیں دیتا۔"

مارشل پیتھوجینک نے جنرل کے رینک کا خیال رکھے بغیر چیخ کر کہا "او احمق، بدھو، نالائق کسی علاقے کے! کس خیال کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ ذات کے جراثیم، نسل کے مائیکروب، خردبین کے بغیر معدوم الذات اور چلے ہو ٹیلی ویژن کی ورکنگ سمجھنے.... فیکس مشین کا اندر پیٹا معلوم کرنے! تم سا بے حیا ذی رُوح میں نے اپنی ساری سروس میں نہیں دیکھا۔ کبھی اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟"

جنرل نے خفیف ہو کر سر جھکا لیا اور شرمندگی سے بولا "سر! انسان بھی تو خدا کی ذات اور اس کی کنہ معلوم کرنے میں کب سے لگا ہوا ہے حالانکہ اس کا وجود خدا کے مقابلے میں ہم جراثیموں سے بھی کئی ارب بلکہ کھرب گنا چھوٹا ہے... بلکہ کوئی وجود ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر اُن کو کیا ملا؟" مارشل نے پوچھا "باتیں! مکالمے!! گفتگو!!! کیا تم بھی انہی کی طرح ہو کر رہنا چاہتے ہو؟ — اُٹھو! اپنا جنگی نقشہ نکالو اور اپنے پلان کے مطابق پھر سے کام شروع کرو۔ تم کو کیا لینا ہے رنگ دار ٹی وی سے اور اس کی ورکنگ سے؟"

ابھی مارشل یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اردگرد کھڑے ہوئے خون کے سفید خلئے اُن پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے کڑچ کڑچ کر کے اُن کو نگل گئے۔

راحیلہ نے اپنے منگیتر کا بھاری بھرکم سر دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا کر کہا "بس کرو بہانے باز اور اُٹھاؤ اپنا یہ ہنڈا سا سر میرے سینے سے.... اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی اور نہ ہی کوئی کسی کی ہڈیاں چبا رہا ہے۔ اس وقت تو تمہی میری پسلیاں توڑ رہے ہو۔ اُٹھاؤ اس بھرکم تودے کو!"

کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ

رات کے نو ساڑھے نو بجے میں اپنی پرانی سائیکل پر سوار ملتان روڈ کی متوازی سڑک پر لاہور کی جانب آ رہا تھا۔ یہ سردیوں کی رات تھی لیکن ابھی بہت سے لوگ سڑکوں، راستوں اور پگڈنڈیوں پر موجود تھے۔ کوئی سڑک سے اُتر کر پیچھے کھیتوں کی جانب جا رہا تھا، کوئی کھیتوں سے اُوپر سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ میرا رُخ لاہور کی طرف تھا اور پانی سے لبالب بھری ہوئی نہر میرے بائیں ہاتھ میری مخالف سمت جا رہی تھی۔

اچانک مجھے محلے داروں کے باغ کے پاس ایک بہت بڑا انجن نظر آیا۔ اس انجن کی تین بتیاں روشن تھیں اور دو بجھی ہوئی تھیں۔ انجن والے بھائی نے تالی بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میں سائیکل سے اُتر کر پلیا پر ہو لیا اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گیا۔

وہ کرہ ارض کا ڈرائیور نہیں تھا، کسی اور منطقے کا گاڑی چلانے والا تھا۔ جب میں نے غور سے انجن کی طرف دیکھا تو وہ انجن نہیں تھا بلکہ پرانی طرز کی ایک اُڑن طشتری تھی جس کے بارے میں میں نے اپنے لڑکپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اُڑن طشتری تھی تو پرانی لیکن کسی نے بڑی سنبھال کے رکھی تھی۔ ابھی تک اس کا اپنا اوریجنل پینٹ تھا اور اُوپر کی ٹربائن بالکل خاموشی سے گھوم رہی تھی۔

ڈرائیور نے مجھے ایک تار دکھا کر اشارے سے سمجھایا کہ جونہی اس کی قریبی سبز بتی جلے، میں تار کو زور سے کھینچی مار کر پیچھے کو بھاگ جاؤں اور آم کے اس بڑے درخت کے پیچھے چھپ جاؤں۔

مجھے چونکہ رفاہ عامہ کے کاموں سے گہری دلچسپی ہے اور میں پردیسیوں کی مدد

کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں اس لئے میں نے اپنی سائیکل بڑے آم کے تنے سے لگا دی اور خود آستین چڑھا کر تار کھینچنے پر تیار ہو گیا۔

ڈرائیور اُڑن طشتری کے اندر اپنی سیٹ پر اتر چکا تھا اور اس نے ٹربائن کی سپیڈ بہت ہی تیز کر دی تھی۔ تار چونکہ بہت ہی چکنی دھات کی تھی اس لئے میں نے اُسے اپنی کلائی کے گرد ایک چکر دے کر لپیٹ لیا اور بتی پر نگاہیں گاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ تار ٹھنڈی ہو رہی ہو اور اس سے برف کی دھند برآمد ہونے لگی ہو۔

اچانک سبز بتی جلی..... چھوٹی سی تیز بتی! میں نے تار کو پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دیا اور اُڑن طشتری نے بھک کے ساتھ ایک زقند بھری۔ اس زقند کے ساتھ ہی اس کے پیٹ کے ایک کنارے پر دو بڑے بڑے لاکر سے کھلے اور اُن میں سے ایک نے سڑکا مار کر مجھے اپنے اندر کھینچ لیا۔ لاکر کے اندر میرا سر زور سے اس کی چھت سے ٹکرایا جہاں فوم کی موٹی کشننگ کی ہوئی تھی اور جہاں سے میوزک قسم کی کوئی آواز آ رہی تھی۔

لاکر میں بیٹھنے کی کوئی باقاعدہ جگہ تو نہیں تھی البتہ یہاں پاؤں پھنسانے کے لئے رکابوں جیسے دو اڈے سے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اُن میں اپنی ایڑیاں پھنسا کر سوچنا شروع کیا کہ گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ اطلاع دینے کی کوئی صورت نہیں تھی اور میں یہاں سے نکل کر کہیں اور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اُڑن طشتری کی ڈیزائننگ بہت ہی بری لگی لیکن یہ چونکہ ایک بہت ہی پرانا ماڈل تھا اس لئے اس میں اور بھی کئی خامیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔

کوئی آدھا راستہ طے کرنے کے بعد یہ اُڑن طشتری پھر خراب ہو گئی اور جس طرح بھک کر کے چلی تھی اسی طرح بھک بھک کر کے پھر رک گئی۔

ڈرائیور نے مجھے لاکر میں بیٹھے دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھا لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ وہ پرانی وضع کا ایک خوش طبع سا ڈرائیور تھا لیکن کمپنی کے رولز کے مطابق اُسے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں اب کیا کروں؟" تو اُس نے ایک تسلی

آمیز اشارہ کیا اور مجھے اُڑن طشتری سے باہر لے آیا۔ قریب ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کوئی دوسری قسم کی مخلوق تھی جو اس منطقے کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس میں کچھ کچھ ہمارے جیسی خو بو تھی اور وہ بہت بے تکلف قسم کا ڈرائیور تھا۔

اس نے اندر بیٹھتے ہی تیز رفتاری کے ساتھ گفتگو شروع کر دی اور بار بار پیچھے مڑ کر دلو طب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی زبان کچھ عجیب سی تھی..... اُردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، براہوئی، شینا کھوار، بلتی، ہنزاکٹ، کلاش، بروشسکی، فندے، پوٹھوہار اور ہندکو کا کھچڑ سی تھی۔ مجھے اس کے بہت سے الفاظ آسانی کے ساتھ سمجھ آ رہے تھے اور جب میں آگے جھک کر زیادہ غور کرتا تھا تو مجھے اس کے فقرے بھی سمجھ میں آنے لگتے تھے۔

میں نے کہا "اس وقت ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

اُس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "اس وقت ہم چھوٹی کہکشاں کے اُوپر جا رہے ہیں اور ہماری دائیں جانب خوف ناک کوارکوں کی وادی ہے۔ کوئی شخص رات کے وقت حیوانی کہکشاں سے نہیں گزرتا۔ سبھی ڈرتے ہیں، سوائے اس حقیر فقیر کے۔"

جب وہ بولتا تھا تو الفاظ اس کے منہ سے خبروں سے پہلے کے ٹائم سگنل کی طرح آواز دیتے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک کوک سی سنائی دیتی تھی۔ اس نے میری طرف گردن گھما کر پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟" تو میں نے سر ہلا کر کہا" مجھے کیا معلوم! میں تو پٹواری ضابطے خان سے مل کر آ رہا تھا کہ اس نے اپنی اُڑن طشتری کو مجھ سے دھکا لگوایا اور میں کھنچ کر ساتھ ہی آ گیا۔"

"کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟" اس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا تو میں نے جھوٹ موٹ اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا کہ "ذرا سی کہنی چھل گئی تھی اور اس کے ساتھ دائیں گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ سر بھی چھت کے ساتھ ٹکرایا تھا لیکن اس کی مجھے چنداں پروا نہیں۔ جو وقت بھی گزر رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔"

پھر اس نے اچانک بریکیں لگا کر ایک زور کی سکرچ ماری اور راستہ بدل لیا۔ میں سیٹ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "شکر ہے ہم بچ گئے ورنہ ابھی مارے جاتا تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

اس نے پیچھے کو اشارہ کر کے کہا "چھوٹی کہکشاں کے خاتمے پر دو بلیک ہول کھڑے ہیں..... بد نسل قسم کے بلیک ہول جو ہر چھوٹی بڑی گاڑی کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ میں نے جب ایک بڈھے ستارے کو اُن کے منہ میں اُترتے دیکھا تو میرے تو پاؤں تلے کا زمانہ نکل گیا۔ میں نے فوراً گاڑی کاٹی۔"

میں نے کہا "کوئی ان بلیک ہولوں کو منع نہیں کرتا..... اُن پر پابندی نہیں لگاتا؟"

"کوئی نہیں لگاتا جی اُن پر پابندی۔" اس نے دکھی ہو کر کہا "اب وہ پہلے والا زمانہ نہیں رہا کھلی کائنات کا، اب یہاں بھی گھپلے بازی ہونے لگی ہے۔"

میں نے کہا "اور یہاں کی انتظامیہ، کرہ فضائیہ کی..... وہ ؟"

"سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔" اس نے رنجیدہ ہو کر کہا "پہلے وقتوں میں جب دو ستارے ٹکرا جاتے تھے تو مہینہ مہینہ بھر ستاروں میں روشنی نہیں رہتی تھی۔ کسی کے ہاں چراغ تک نہیں جلتا تھا لیکن اب کہکشائیں ٹکرا جاتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" پھر اس نے میری طرف چہرہ گھمائے بغیر کہا "آپ کے وہاں کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے یہاں بلیک ہول تو نہیں ہوتے البتہ مین ہول ضرور ہوتے ہیں جو بلیک ہولوں کی طرح منہ کھولے انسانوں کو نگلتے رہتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوا اور بڑی دیر تک چپ چاپ ٹیکسی چلاتا رہا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں یا یہ مجھے کدھر لے جا رہا ہے..... جس طرح لیڈروں کے پیچھے اُن کے عوام چپ چاپ چلتے رہتے ہیں اور اُن کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور ان کے لیڈروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عوام کو کدھر لے جا رہے ہیں، ایسی ہی کچھ میری کیفیت تھی۔

اس نے ونڈ سکرین پر نگاہیں گاڑے گاڑے مجھ سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں کہانیاں لکھتا ہوں۔"

اس نے کہا "اپنی کوئی کہانی مجھے بھی سناؤ۔"

میں کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن میری کوئی کہانی ایسی اچھی نہ تھی جو اس کو سنائی جا سکتی تھی۔ جو کچھ اچھی تھیں تو وہ بہت لمبی تھیں اور اب مجھے ان کا تسلسل بھی یاد نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی پسندیدہ کہانی سنانا شروع کر دی جو اصل میں میری نہ تھی بلکہ میرے دوست اے حمید کی تھی۔ اس کہانی میں ناریل کے درختوں، چائے کے ساواروں، سمندر کی لہروں اور جنگل سے اٹھنے والی پھواروں کا ذکر تھا جن کے درمیان سنتھالی عورتیں گاتیاں باندھے ایک دوسری کو آوازیں دیتی ہوئی گھوم رہی تھیں۔

اس نے گاڑی روک کر کہا "مجھے دکھاؤ، مجھے دکھاؤ۔"

میں نے کہا "کیا دکھاؤں؟" تو اس نے کہا "وہی سب کچھ جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے۔"

میں نے ہنس کر دکھ بھرے لہجے میں کہا "یہ سب کچھ میں تمہیں کیسے دکھاؤں۔ یہ علاقہ تو زمین پر ہے اور یہ لوگ وہیں رہتے ہیں۔"

زمین کا نام سن کر وہ ذرا اداس سا ہو گیا اور غم ناک لہجے میں بولا "زمین! — کہاں ہے یہ زمین؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔

کہکشاں کے آخری سرے سے گزرتے ہوئے میں نے چلا کر کہا "روکو روکو..... زمین آ گئی، زمین آ گئی۔" اس نے احمقوں کی طرح میری جانب دیکھا تو میں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا "روکو روکو۔ یہی تو زمین ہے۔ یہی تو زمین ہے۔"

اس نے زور کی بریکیں لگائیں تو ہماری ٹیکسی رکتے رکتے جاپان، آسٹریلیا، انڈونیشیا، ملائشیا سے گزرتی ہوئی اوکاڑے کے بازار میں جا رکی۔

آدھی رات کا عمل ہو گا۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ کوئی کوئی کھوکھا کھلا تھا۔ ایک ریڑھی والا گیس کی بتی جلا کر ابھی تک گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ دودھ دہی کی دوکان کے آگے چند منہ زور لڑکے چہل بازیاں کر رہے تھے۔ ان کی حرکتیں تھوڑی تھوڑی فحش سی تھیں لیکن اوکاڑے جیسے مقام پر آدھی رات کے وقت کون دیکھتا تھا!

جب میں ٹیکسی سے باہر نکلا اور ٹیکسی والے نے اپنی سیٹ سے برآمد ہو کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا تو میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ فحش حرکتیں کرنے والے لڑکے اپنی حرکتیں چھوڑ کر ہم کو غور سے دیکھنے لگے۔ بابا دوکاندار جو گرم گرم دودھ سے بھری کنالیوں میں جاگ لگا رہا تھا، اپنا پھینٹی کرنے والا ڈبہ روک کر ہمیں دیکھنے لگا۔

مجھے اور ٹیکسی والے کو ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے میں تھوڑی سی دیر لگ گئی۔ اتنے میں وہ لڑکے ہمارے قریب آ گئے لیکن ٹیکسی والا اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا ہوا ہو گیا اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں کہاں ہوں..... کون ہوں..... اور ابھی کس کے ساتھ تھا!

ان لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا "آپ اشفاق صاحب ہیں؟" میں نے کہا "ہاں، تم نے ٹھیک پہچانا۔" پھر دوسرے نے پوچھا "یہ ٹیکسی والا کون تھا؟ — یہ تو کوئی عجیب سی مخلوق تھی۔ آپ کو کہاں سے ملی؟"

پیشتر اس کے کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، اس کے ایک لمبے تڑنگے ساتھی نے کہا "اوئے تم نے پہچانا نہیں، یہ باقر علی عرضی نویس کا بیٹا تھا جو دس بارہ سال ہوئے گھر سے دوبئی جانے کے لیے بھاگ گیا تھا۔ سیدھا سادا معصوم نوجوان تھا۔ نوسر بازوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے دھوکے سے گوادر لا کر ایک پرانی وضع کی اگن بوٹ میں بٹھا کر چھوڑ دیا اور خود بھاگ گئے۔"

پہلے والے لڑکے نے کہا "میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، ہمارے ساتھ فلاش کھیلتا رہا ہے اور ہمیشہ ہارتا رہا ہے۔ شین کے بجائے سین بولتا تھا۔ شکر کو سکر اور شاباش کو ساباس کہا کرتا تھا۔"

پھر انہوں نے یک زبان ہو کر پوچھا "آپ کو کہاں مل گیا؟"

"ٹیکسی سٹینڈ پر!"

"کون سے ٹیکسی سٹینڈ پر؟"

"چھوٹی کہکشاں کے ٹیکسی سٹینڈ پر۔"

وہ حیرانی سے میرا مُنہ تکنے لگے اور تھوڑی دیر تک اسی طرح سے کھڑے

رہے۔ پھر اُن میں سے ایک بولا "اوئے یہ اشفاق صاحب تو نہیں، یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ تو دغ دغ کرتا لال سرخ سا انسان تھا۔ یہ تو خوف زدہ اور پیلا پیلا سا فرد ہے۔"

پھر وہ مجھے اوکاڑے کے بازار میں اکیلا چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

جب میں واپس باغ محلے داراں میں پہنچا تو آم کے تنے سے لگی میری سائیکل چوری ہو چکی تھی!

پوری جان کاری

ہڑپہ سے سات میل جنوب کی جانب "ماہڑا" نامی ایک اور بستی دریافت ہوئی ہے جو ہڑپہ سے بھی دس ہزار سال قدیم کی ایک آبادی ہے۔ اس کے آثار شرقاً غرباً کچھ اس طرح سے پھیلے ہوئے ہیں کہ موجودہ حالات میں اُن کی کھدائی کافی مشکل ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان کے پاس تو اتنے مالی ذرائع نہیں کہ وہ بلاواسطہ طور پر اس آثار کی کھدائی کروا سکے البتہ سمتھ لوپئین نے اس کے ایک کونے کی رونمائی کے لئے تین ملین ڈالر خرچ کرنے کے بعد یہاں ہر قسم کا کام رکوا دیا ہے کہ ایسے شہر کو آرام سے نکالا جائے گا اور سکون کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

اب تک کی کھدائی کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ "ماہڑا" ایک ترقی یافتہ شہر تھا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ یہاں کے بہت کم لوگ ہسٹری، فلسفے، الہیات اور قانون سے واقف تھے۔ ماہڑا کے باشندے کم آمیز، کم کوش اور کم سخن تھے اور اُن کے درمیان کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اُن میں ہر بات کو سمجھنے، پرکھنے اور اختیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔

ہڑپہ میں آثار کی کھدائی کا مزید کام کرنے پر جوزف نیٹ مامور تھا۔ اس کے ساتھ باب رابن اور ایدا تولی ریسرچ سکالروں کے طور پر وابستہ تھے لیکن اس میں جوزف کا سب سے بڑا سہارا اس کی بیوی کیرولین تھی جو انتھروپولوجی کے میدان میں روتھ بینے ڈکٹ اور مارگرٹ میڈ کی شاگرد رہ چکی تھی۔ انتھروپولوجی کے تحقیقاتی علمی گروہ کو اچانک چھوڑ کر وہ آثار قدیمہ کی کھدائی کے کام سے منسلک ہو گئی اور پھر اُسے اپنے آگے پیچھے کی کوئی خبر نہ رہی۔ جوزف سے شادی کرنے کے بعد بھی وہ اپنے ہر

کام میں آزاد رہی اور اس آزادی کے سہارے بہت سے معاملات میں جوزف سے بھی آگے نکل گئی۔

جب وہ صبح کی ہڑپے سے نکلی شام تک واپس نہ آئی تو جوزف کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ساہیوال کے نوجوان منڈے اُسے ورغلا کر دریا پار ہی نہ لے گئے ہوں..... لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ دریا کے اُرار ہی لڑکوں کو سب راز بتا دیتی تھی جن کا علم لڑکوں کو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ اس علاقے میں کوئی اچھے سکول نہیں تھے اور لڑکے لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ تھے اس لئے کیرولین پرندوں اور مکھیوں کا علم اُنہیں اپنے وجود کے نقشے پر پڑھا دیتی تھی..... مگر آج شام جو اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

اس نے اچانک بابے مودن کی نیائیں میں بیری کے بڈھے درخت کے پاس ایک انوکھی پرانی اینٹ دریافت کر لی تھی جس کا تعلق کسی ایسی قدیم تہذیب سے تھا جو ابھی کتابوں میں مذکور نہ ہوئی تھی۔

کیرولین نے اپنے چرمی تھیلے سے سٹیل کی چھوٹی گینتی نکال کر نیائیں کے شمالی قب پر جو پہلی ضرب لگائی تو گویا اس نے اندر سے آواز دی "ہم ہیں! ہم ہیں! لیکن ذرا آہستہ..... آہستہ اور اس سے بھی آہستہ۔" تھوڑی سے مٹی اکھیڑ کر اس نے برش سے جگہ صاف کی تو اُسے یقین نہ آیا کہ وہ پہلی ہی پیش قدمی میں سیدھے راستے پر آ گئی ہے۔

دو دن اور دو راتیں چھوٹی حویلی میں گزارنے کے بعد جب وہ ہڑپہ کی سائٹ پر آئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارہ بن چکی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیوں کے موٹے موٹے چھلکے مونگ پھلی کے دانے کی لال پرت کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ اس نے جب اپنی خرخری آواز میں چیخ کر جوزف کو بتایا کہ اُدھر ہزاروں سال کی غرقیدہ ایک اور بستی بھی موجود ہے تو جوزف اُسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر دیوانہ وار اُس طرف کو بھاگا اور راستہ بھر خوشی کی خوف ناک چیخیں مارتا گیا کیونکہ اُسے اپنی بیوی کی فطانت کے ساتھ ساتھ اس کی کشفی کیفیت پر بھی بڑا اعتماد تھا۔

جب وہ دونوں اس مقام پر پہنچے تو جوزف نے کیرولین کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس

نئی ڈسکوری پر شدت کے ساتھ اُس کا منہ چومنا شروع کر دیا۔ جب بکریاں چرانے والے لڑکوں نے یہ نظارا دیکھا تو اُنہوں نے کھیت سے ڈھیلے اُٹھا اُٹھا کر اُن پر برسانے شروع کر دیئے۔ اگر اُن چرواہوں کا دائرہ اُن کے بہت ہی قریب نہ آجاتا تو پتہ نہیں وفورِ شوق سے کیا ہوتا! بہرکیف کھدائی کے لئے بستی کا ایک کونہ انگڑائی لے کر ان کے سامنے آگیا اور ایک نئی دُنیا دریافت ہو گئی۔

ہڑپہ میں ڈیڑھ سال سے جو کام ہو رہا تھا، وہ تو التوا میں پڑ گیا اور ہڑپہ کے جنوب میں ماہڑا نامی بستی میں کھدائی شروع ہو گئی۔ اٹلی، چیکوسلووکیہ اور امریکا کے تین ماہرین آثار قدیمہ سائٹ پر پہنچ گئے۔ متعلقہ لیب کا بہت سا سامان بذریعہ ہوائی جہاز لاہور اور لاہور سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ماہڑا پہنچ گیا۔ لیب میں اس بستی کی قدامت کے آثار ٹیسٹ ہونے گئے۔

پتہ چلا کہ یہ بستی نہ صرف اپنے عہد کی ایک ترقی یافتہ بستی تھی بلکہ آج کے حوالے سے بھی ایک ایسی آبادی تھی جس میں وہ تمام ساز و سامان موجود تھا جس کی ہم آج سے کوئی دو سو سال بعد اپنے شہروں میں ہونے کی توقع کرتے ہیں۔ موقع پر موجود سب ماہرین آثار قدیمہ اس حقیقت پر متفق تھے کہ یہ شہر، یہ میٹروپولیٹن شہر سائنس اور ٹیکنالوجی کا معبد تھا اور یہاں کی زندگی اور زندگی کا ہر چلن سائنٹفک بنیادوں پر استوار تھا۔ یہاں ہر طرح کا علم..... سائنسی علم، روزمرہ کا علم، دینی اور روحانی علم، حیوانی اور سفلی علم غرضیکہ ہر طرح کا علم اپنے نکتہ عروج کو پہنچ چکا تھا اور اس کے بعد کسی اور علم کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ساری آبادی معلومات سے لبریز ہو گئی تھی!

لوگ خوبصورت تھے.... صحت مند اور خوش حال تھے..... فکر معاش اور فکر معاد سے آزاد تھے۔ زندگی گزارنے کے لئے ہر طرح کی آسانی موجود تھی اور سفر کے ہر طرح کے ذرائع عام تھے حتیٰ کہ انسانی وجود بھی الیکٹرانک سگنل کی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی پہنچائے جاتے تھے۔

چونکہ کھیتی باڑی، صنعت و حرفت، تجارت اور کاروبار سب سائنس کے زور پر ہوتے تھے اس لئے لوگوں میں اقتصادی اُونچ نیچ نہیں تھی اور سارا معاشرہ ایک ہی بنیاد

پر قائم تھا۔ طبقاتی کشمکش نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا علم ہی نہ تھا اور جسمانی اور بدنی بیماریاں اس لئے ناپید تھیں کہ پیدا ہوتے ہی سارے بچوں کو جملہ بیماریوں کے خلاف ٹیکہ بند کر دیا جاتا اور ہر وجود ائمیون ہو جاتا تھا۔ جنسی آزادی اس درجہ تھی کہ کوئی شخص بھی بے راہ روی کا شکار نہ تھا نہ مرد نہ عورت! ہر کوئی دوسرے کو جنسی طور پر جانتا تھا!

تعلیم اور معلومات عامہ کا حصول لازمی تھا اور اس کے لئے کوئی معاوضہ یا فیس مقرر نہیں تھی۔ ہر محلے کے ہر کونے پر علم کدے موجود تھے اور ہر علم کدے میں سو سو معلومات سینٹر تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے گھروں میں بھی کمپیوٹر لگائے ہوئے تھے جو علم کدوں سے اور معلومات سینٹرز سے پیچاں تھے۔ جس کو جس قسم کی معلومات درکار ہوتی تھیں، کمپیوٹر پر ایک انگلی چلا کر حاصل کر لی جاتی تھی۔ ہر ایک کو ہر وقت اپنی بڑھتی گھٹتی حیثیت عرفی کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ہر کلائی پر اس قسم کا میٹر بندھا ہوتا تھا جو وجود کے اندر باہر، اردگرد اور آس پاس کی خبر دیتا رہتا تھا۔

"ماہڑا" کے لوگوں کے پاس اتنا علم تھا اور علم عطا کرنے کے اتنے وسائل تھے کہ اُنہوں نے ماہڑا کے باشندوں کی زندگی سے ہر طرح کے سر، بھید، رمز اور مسٹری کو نکال دیا تھا اور وہ حیرت اور تجسّس کی دیہاتی جبلت سے بالکل آزاد ہو گئے تھے۔ اُن کے لئے کوئی راز راز نہیں تھا اور کوئی مسٹری مسٹری نہیں رہ گئی تھی۔ اُن کو ہر شے کا علم اور ہر علم کی تشریح معلوم تھی۔

"ماہڑا" کا معاشرہ وہ خوش قسمت معاشرہ تھا جس کے ہر فرد کو ہر چیز معلوم تھی اور اُن کے درمیان کبھی مناظرہ، مکالمہ، مجادلہ یا مباہلہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑنے جھگڑنے کے فن سے ناآشنا تھے اور محبت اور یگانگت کی خوش گوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ اول تو اُن کو دُنیا کے سارے سوالوں کے جواب معلوم تھے اور اُن کے لئے کوئی بھید، بھید نہیں رہ گیا تھا پھر بھی اگر اُن کو کسی بھید کی تفصیلات معلوم کرنا ہوتی تھیں تو وہ اپنے محلے کے علم کدے میں جا کر بڑے کمپیوٹر کا بٹن دبا کے ساری معلومات حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کیا مرد، کیا عورتیں سبھی علم کی ایسی آب یاری سے روشن روشن چہرے لے کر گلی محلوں میں گھوما کرتیں اور تفریحاً ایک دوسرے کو چوما کرتیں۔

لوگوں کو چونکہ سارے سوالوں کے جواب آتے تھے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے ساری آبادی، سارے ماحول اور ساری خدائی کو Demystify کر دیا تھا اس لئے لوگ زیادہ تر دیواروں کے ساتھ ڈھو لگا کر بیٹھے رہتے تھے اور لذت معلوم کے نشے میں ڈوبے ایک دوسرے کو تکا کرتے تھے۔

بچے بھی سب کچھ جانتے تھے، عورتیں بھی جانتی تھیں، بڈھے بابے بھی آگاہی کی بیساکھیوں پر پڑے جھولتے تھے۔ ہر طرف جان کاری ہی جان کاری تھی۔ چنانچہ ہر شخص علم کی ڈور میں لپٹا ہوا تھا اور علم ہی اُن کی واحد میراث تھی۔

"ماہڑا" کی بستی میں عشق و محبت کا جھمیلا نہیں تھا۔ نہ کوئی عاشق تھا نہ معشوق، نہ رقیب نہ محتسب۔ ہر ایک کو ہر ایک کی ڈیوٹی کا پتہ ہوتا تھا، کسی کا کسی سے کوئی رگڑا جھگڑا نہ تھا۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا تھا اور ہر شے علم و ابلاغ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہر ایک کو اپنے محبوب کی موجودگی کا، اس کے موڈ کا، اس کے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر کا علم ہوتا تھا۔ جو کوئی اپنے محبوب کے لئے زیادہ غلطاں ہوتا، وہ کمپیوٹر پر اس کا ای سی جی اور سی ٹی سکین کر کے بھی دیکھ لیتا تھا۔ بھرپور علم کی بدولت اور ہر طرح کی معلومات میسر ہونے کی وجہ سے کوئی تحیر اور تجسس میں مبتلا نہیں تھا اس لئے کسی قسم کی تانکا جھانکی، خطوط بازی یا فون نوازی نہیں ہوتی تھی۔ جب سب کو ایک دوسرے کا علم ہی تھا کہ کس رنگ میں ہے تو پھر سر اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے سے فائدہ۔ سب مزے میں تھے اور سب تکیوں پر سر رکھ کر فری علم کے اور مفت معلومات کے مزے لوٹتے تھے۔ یہ دُنیا کا سب سے بڑا نشہ تھا!

یہ جو ہمارے معاشروں میں ہر وقت ایک افراتفری، بھاگا دوڑی، تانابتھاری اور بوجھ بجھول سی لگی رہتی ہے اور ہر فرد، ہر معاشرہ، ہر گروہ اور ہر ملک دوسروں کی کنسوئیاں لیتا رہتا ہے تو یہ بات ماہڑا کی عظیم الشان بستی میں نہیں تھی۔ ساری راج دھانی میں نہ تو کوئی سی آئی ڈی تھی نہ سی آئی اے، نہ ایف آئی ڈی نہ کے جی بی، نہ را نہ موساد۔ ہر قسم کی انفرمیشن اول تو پہلے ہی ہر کسی کے پاس تھی اور جو کوئی ایک آدھ بات معلوم نہ ہوتی تو اُسے بٹن دبا کے معلوم کیا جا سکتا تھا.....

کیرولین کا اندازہ تھا کہ ایسا علم، ایسا وسعت پذیر احاطہ معلومات اور حلقہ آگہی